© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

عہدِ عباسی میں علم کلام کی بحثیں

(امام ابوالحسن اشعریؒ کی مشہور کتاب "مقالات الاسلامیین" کے اردو ترجمہ کا پہلا حصہ مسلمانوں کے عقائد وافکار کے نام سے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کا دوسرا حصہ اس وقت زیرِ طباعت ہے۔ یہاں اس حصے کا مقدمہ نذرِ قارئین ہے ——— مدیر)

زیر نظر کتاب "مسلمانوں کے عقائد وافکار" کی جلد ثانی اپنی آغوش میں جن متکلمانہ اور فلسفیانہ طرفہ طرازیوں کو لیے ہوئے ہے ان سے متعلق مختصر انداز میں اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ فکر و نظر کے اس بہار آفریں دبستاں پر کہ جس کی مسلمانوں کے ذوقِ سلیم نے آبیاری کی تھی چونکہ ایک ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے اور اس اثنا میں قافلۂ علم و فن کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے، اس لیے کوئی چاہے بھی تو اس کی نکہت و بو کی رنگینیوں سے کما حقہٗ لطف اندوز نہیں ہو سکتا بلکہ اسے خطرہ یہ درپیش ہے کہ قارئین کرام کہیں اس مجموعہ پر فرسودگی کی پھبتی نہ کسیں اور یہ نہ کہہ دیں کہ اس دور میں بھلا اس دفترِ پارینہ کو پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اعتراض کی اس نوعیت میں خاصا وزن ہے۔ لیکن ہماری مجبوری اور قابلِ صد ناز مجبوری یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ ہم نے تاریخ کے دھاروں کو بدلا ہے۔ اور اس کو نیا روپ عطا کیا ہے۔ ہم نے ایک زندہ، فعال اور پاکیزہ تر معاشرے کی تخلیق کی ہے۔ اور اپنے دور میں علم و عرفاں کی مشعلوں کو فروزاں رکھا ہے۔ اس لیے ہم ماضی و حال کی علمی کاوشوں کو الگ الگ اور بے ربط خانوں میں تقسیم کر دینے کے حق میں نہیں۔ ہم تاریخ کی ان مختلف کڑیوں کو ارتقا کا منطقی نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اور دیانتداری سے یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ درخشاں اور تاباں حال جس سے ہماری نظریں خیرہ ہو رہی ہیں، ہمارے ہی شاندار ماضی کا رہینِ منت ہے۔

ہماری تہذیبی اور علمی تاریخ جس تیزی اور برق رفتاری سے بدل رہی ہے، ہمیں اس کا پورا پورا احساس ہے۔ اس لیے ہم ماضی میں اس طرح کھو جانے کے قائل نہیں ہیں کہ حال کے تقاضے یکسر نظروں سے اوجھل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوجائیں۔ علاوہ ازیں تاریخ کے بارہ میں ہم اس نقطۂ نظر کو بھی اپنانے سے قاصر ہیں کہ صرف ماضی ہی کی مدح سرائی میں اپنی توانائیوں کو کھپا دیا جائے اور حال و مستقبل کی فکری تعمیر میں کوئی حصہ نہ لیا جائے۔ اس کے باوجود ہم اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ ماضی میں ہم نے علم و ادراک کی شمیم آرائیوں کو عام کر کے تہذیب و تمدن کی جو خدمت کی ہے، وہ ہر پہلو سے اہم اور عظیم ہے۔ یہی نہیں علم و ادراک کے اس دفترِ کہنہ میں تابش وضو کے ایسے متعدد اور حیران کن مظاہر بھی پائے جاتے ہیں کہ جن سے نہ صرف حال کی تابناکیوں کا راز فاش ہوتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی عبقریت کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے محض ذہانت اور خیال آرائی کے بل پر کیونکر ان منزلوں تک رسائی حاصل کر لی جن تک پہنچنے کے لیے تجربہ و مشاہدہ بے حد ضروری ہے۔

یہ وہ احساس فخر ہے جو ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم ماضی کے ان علمی کارناموں کو یاد رکھیں اور ان کو نئے نئے انداز سے پیش کریں۔ مزید براں اگر ہمیں حال کی تعمیر نو میں حصہ لینا ہے تو لازم ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے بارہ میں کسی قسم کے احساس کہتری میں مبتلا نہ ہوں۔

یہ بات صحیح ہے کہ اس تاریخی اور تہذیبی اہمیت کے باوجود آج یہ خیالات و افکار کھٹکتے ہیں اور ان کی موزونیت (Relevancy) کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں ہو پاتا۔ لیکن یہ زاویۂ نظر کا قصور ہے۔ ان کو اس فکری ماحول میں رکھ کر دیکھیے جس میں یہ ابھرے اور بحث و کلام کی ندرتوں کا محور بنے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ نہ صرف حد درجہ موزوں ہیں، بلکہ ضروری ہیں۔

جن لوگوں نے مذاہب و افکار کی تاریخ کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ کوئی بھی فلسفہ یا نظام فکر آپ سے آپ پیدا نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ہر ہر دور میں فلسفہ و کلام کی جدتیں زندگی کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ یعنی ہر ہر دور کے مروجہ تصورات، زیر بحث مسائل، اجتماعی حالات، اخلاقی اور روحانی قدریں، وہ عناصر ہیں جو مل جل کر نئے سوالات کو بساط بحث پر لاتے ہیں اور ایسے حالات پیدا کرتے ہیں کہ جن کی وجہ سے کسی قوم کو موقع ملتا ہے کہ وہ ان کے ردِ عمل میں اپنی فکر کو منظم کرے۔ اپنے خیالات کے لیے فلسفیانہ بنیادیں ڈھونڈے، اور پیش آئندہ اشکالات کو کسی معقول انداز سے حل کرے۔ چنانچہ مسیح سے چار پانچ سو سال پہلے یونان میں جو حکمت و دانش کے سوتے پھوٹے اور سقراط، افلاطون اور ارسطو ایسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں تو یہ محض بخت و اتفاق کا کرشمہ نہ تھا بلکہ یونانی ریاستوں کا خاص

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظم ونسق، ان میں عوام کا عمل ودخل اور اشتراک بحث ونظر کا رواج اور افکار وخیالات کے اظہار کی پوری پوری آزادی، وہ جانے بوجھے عوامل تھے جنھوں نے فلسفہ وحکمت کے ان اساطین کی تخلیق کی۔ اور فکر ونظر کی ایسی مشعلوں کو روشن کیا کہ آج بھی جن کی لَو سے جہانِ علم وفضل ضیا افروز ہے[1]

مسلمانوں نے الٰہیات وحکمت کے میدان میں جو تگ وتاز کی۔ اور عجیب وغریب سوالات کو چھیڑا۔ اس کا بھی یونانی فلسفہ کی طرح سنجیدہ پس منظر ہے۔ ان کے بارہ میں یہ رائے قائم کر لینا سخت غلطی ہوگی کہ ان کی یہ موشگافیاں، اور فکر وخیال کی رنگینیاں محض عیش وفراغ کے چوچلے تھے، جس کی ذمہ داری عباسیوں کے عہد طرب اور مجالس بحث ونشاط پر ڈالی جاسکتی ہے۔ وہ سنجیدہ پس منظر جس نے اسلامی ذہن کو صدیوں فلسفیانہ بحثوں میں الجھائے رکھا، یہ تھا کہ جب اسلام دوسری قوموں میں پھیلا اور مسلمانوں کو موقع ملا کہ ایران وروم کی پُرشکوہ تہذیب کو قریب سے دیکھیں یا یوں کہنا چاہیے کہ جب اسلامی فکر یونانی فکر سے متصادم ہوا تو اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے تھا کہ نئے نئے سوالات ذہنوں میں خلش پیدا کریں اور ان سے نمٹنے کے لیے مسلمان اپنے ہاں کے فہم وادراک کے پیمانوں کو از سر نو ترتیب دیں اور یہ کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ انسانی ذہن کا بڑا المیہ ہے کہ یہ زلیست کے ایک اسلوب وانداز پر قانع نہیں رہتا۔ بلکہ کبھی تو یہ چاہتا ہے کہ عقل ہرزہ کار کی فتنہ سامانیوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایمان کے حصن حصین میں پناہ لے، سیدھے سادے طریق سے اللہ کو مانے۔ بغیر مین میخ نکالے اس کے حکموں پر چلے اور بنی نوع انسان کی بھلائی اور بہبود کے کاموں میں شرکت وتعاون کو اپنے اطمینان کے لیے کافی سمجھے۔ اور کبھی اس کے قلب میں یہ خواہش مچلنے لگتی ہے کہ ایمان وعقائد کی سادگی واستواری کو دقیق عقل کے سانچوں میں ڈھال کے رہے۔ اس کو فطرت انسانی کا تلون کہیے یا تاریخ کا ناگزیر تقاضا۔ واقعہ بہرحال یہی ہے کہ انسانی ذہن سادگی سے پیچیدگی کی طرف، اور پیچیدگی سے سادگی کی طرف ہمیشہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اور غالباً اسی تلون وتغیر میں تہذیب انسانی کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ مسلمانوں نے فلسفہ وکلام

---

[1] کسی نظام فکر کی تخلیق میں حالات کس حد تک ممد ومعاون ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر انسائیکلوپیڈیا آف دی سوشل سائنسز میں ڈیوی کا مقالہ "فلاسفی" دیکھنے کے لائق ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی پُربہار وادیوں میں خالص دینی وجوہ سے گام فرسائی کی ۔ یونانی عقلیات نے چونکہ نئے نئے سوالات کو ابھار دیا تھا اس لیے اب دانشوروں کا ایک حلقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا، جو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کے بارہ میں غور وخوض کو ضروری قرار دیتا تھا۔ اس سے پہلے ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کی توحید وصفات کے بارہ میں پوری طرح مطمئن تھا اور اس حقیقت پر پختہ ایمان رکھتا تھا کہ اس کی ذات گرامی تمام صفات حسن اور اوصاف کمال سے اتصاف پذیر ہے ۔ اور یہ کہ یہ ذات ستودہ صفات عظیم ہے ۔ اور اس کے وصف علم کا یہ حال ہے کہ دل کی دھڑکنوں تک سے آگاہ ہے ۔ ارادہ کناں ہے اس لیے جو چاہے اور جب چاہے، منصۂ وجود پر جلوہ گر ہو سکتا ہے ۔ خالق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ہر شئے کو اسی نے عدم کی تاریکیوں سے نکال کر وجود کی روشنی بخشی ہے ۔ قدیر ہے اور اس کے وصف قدرت کا یہ عالم ہے کہ کوئی شئے بھی اس کے دائرۂ اختیار سے باہر نہیں ۔ عقائد کی یہ نوعیت دلوں میں اس طرح رچی اور بسی ہوئی تھی کہ اس کے متعلق کبھی بھی شک وسوال کی الجھنیں پیدا ہی نہیں ہوئیں ۔ لیکن علوم عقلیہ کی اشاعت و فروغ سے صورت حال یکسر بدل گئی اور ایک مخصوص گروہ اس چیز کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرنے لگا کہ توحید وصفات کے اس سیدھے سادے تصور کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے کہ ذات وصفات میں رشتہ وتعلق کی نوعیت کیا ہے ؟ خالق کے کیا معنی ہیں ؟ اور آیا تخلیق کے دائرہ میں قرآن بھی داخل ہے یا نہیں ؟ ارادہ سے کیا مراد ہے ؟ علم کی حقیقت کیا ہے اور اس کی وسعتیں مسائل کے کن نازک پہلوؤں کو گھیرے ہوئے ہیں ؟ نیز اس بات کی وضاحت کی جائے کہ قدرت الٰہی کی کارفرمائیوں کے حدود کہاں سے کہاں تک وسعت پذیر ہیں ۔ اس طرح گویا اسلامی علم الکلام کا اصل محور اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات قرار پاتی ہیں ۔ اور باقی تمام بحثیں گو اپنی جگہ بہت اہم ہیں اور مستقل حیثیت بھی رکھتی ہیں ۔ تاہم محض ضمنی ہیں اور مسئلہ صفات ہی کی شاخ اور فرع ہیں ۔ اور یا پھر اس جذبہ طلب وجستجو کا براہ راست نتیجہ ہیں کہ جس کو اس دور کے تاریخی تقاضوں نے ابھار دیا تھا ۔ مثال کے طور پر پہلی بحث ہی کو لیجیے ۔ اس میں ذرہ کے بارہ میں مسلمان حکماء کے خیالات وافکار کا نچوڑ درج ہے ۔ یہ بحث خالص طبیعیاتی نوعیت کی حامل ہے ۔ لیکن اس کا ایک پہلو علم الکلام سے بھی متعلق ہے اور یہی پہلو ایسا ہے کہ جس نے متکلمین اسلام کو اس مسئلہ سے متعلق غور وخوض پر مجبور کیا ۔ ذرہ و توانائی کے بارہ میں ان افکار و خیالات میں کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ندرت پائی جاتی ہے اور فنی اعتبار سے ان بحثوں کا کیا درجہ ہے۔ اس کا اندازہ ڈاکٹر ایس پینس (Dr. S. Pines) کی محققانہ کتاب "مذہب الذرۃ عند المسلمین وعلاقته بمذاهب اليونان والهنود" کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ جس کا جرمنی سے عربی میں کامیاب ترجمہ محمد عبدالہادی ابوزیدہ نے کیا ہے۔ اس کا ماخذ بڑی حد تک "مقالات اسلامیین" ہی ہے۔ قریب قریب اسی موضوع پر ایک بیش قیمت مقالہ او پرٹزل (O. Pretzl) کا بھی ہے جو "جوهر الفرد عند اوائل المتکلمین المسلمین" کے نام سے مشہور ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس نے بھی مقالات ہی سے زیادہ تر استفادہ کیا ہے۔

ان تصریحات سے جو مقالات میں درج ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان متکلمین جوہر فرد کے مفہوم سے پوری طرح آشنا تھے اور اس کے بارہ میں انھوں نے تفصیلی بحثیں سپرد قلم کی ہیں۔ اور عجیب و غریب نکتہ سنجیوں سے کام لیا ہے۔ مسلمان حکما کو اس مسئلہ سے کس حد تک دلچسپی رہی ہے اور کس حد تک اس کے تفصیلی گوشوں کا انھوں نے جائزہ لیا ہے، اس کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں خصوصیت سے دیکھنا چاہئیں۔

(۱) کتاب المسائل فی الاختلاف بین البصریین والبغدادیین۔ مصنفہ ابو رشید سعید بن محمد نیشاپوری۔ اے۔ بیرم (A. Biram) نے اس کے اس حصہ کا ترجمہ کیا ہے جس کا تعلق خصوصیت سے جزء لایتجزی کی بحث سے ہے۔ یہ ۱۹۰۲ء میں لیدن میں چھپ چکا ہے۔

(۲) البحر الذخار۔ تصنیف ابن المرتضیٰ

(۳) کتاب الانتصار۔ تصنیف ابوالحسن علی بن اسمٰعیل الاشعری

مقالات میں جوہر فرد کے لیے متعدد الفاظ آئے ہیں جیسے الجزء الذی لا یتجزیٰ، الجزء الواحد۔ الجزء الواحد الذی لا ینقسم، البعاض۔

اس بحث کا کون پہلو علم الکلام کے دائرہ میں آتا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے وصف علم و قدرت پر غور کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ ہر ہر شے پر قادر ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کو جسم اور اس کے اجزا پر اس حد تک اختیار ہونا چاہیے کہ وہ آخری جز تک کا تجزیہ کر سکے۔ اسی طرح اگر اس کا علم ہر ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے تو اس کو اس کا بھی علم ہونا چاہیے کہ جسم کے آخری ذرہ تک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے علم کی وسعتیں پھیلی ہوئی ہوں۔ اس طرح اس کا تعلق علم و قدرت دونوں سے یکساں ہوا۔ اہل السنۃ کی اکثریت چونکہ اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت کے دائروں کو وسیع تر، اور اطلاق کی حد تک جامع تر مانتے ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک جسم کو بہر حال محدود ہونا چاہیے، اور ایسے ذرات پر مشتمل ہونا چاہیے کہ جو گنے چنے اور تقسیم و تجزیہ کے غیر منطقی عمل کے متحمل نہ ہوں۔

ان کے برعکس حکمائے اسلام نے جزء لایتجزی کا انکار کیا ہے۔ ان کی نظر صفات پر نہیں قوتِ واہمہ پر ہے، جو ہر ہر جز کو تحلیل و تجزیہ کا ہدف قرار دیتی ہے، اور تقسیم کے عمل کو غیر مختتم عرصہ تک جاری رکھنے پر مصر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ زینو کے اشکالِ حرکت کی طرح محض مغالطہ ہے۔ جس کی مزید وضاحت آئے گی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ ارتقا نے جمہور اہل السنت کے نظریہ کی تائید کی ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ تقسیم و تجزیہ کا عمل مسلسل اور غیر مختتم نہیں۔ بلکہ ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں ذرہ اپنی ننھی منی جسامت کھو کر طاقت میں بدل جاتا ہے۔

اشاعرہ نے اجزاء لایتجزی کے غیر متناہی ہونے کے ابطال پر بہت دلچسپ اعتراض وارد کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے اگر ہر ہر شے کے اجزا غیر محدود ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ چیونٹی اور ہاتھی کے ڈیل ڈول اور ضخامت میں کوئی فرق ہی پایا نہیں جاتا۔ اس لیے کہ دونوں کے اجزا غیر محدود اور غیر متناہی ہیں۔ باقلانی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ شہرستانی نے جوہر فرد یا جز لایتجزی کے اثبات میں اسی طنز کو ایک سنجیدہ دلیل کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہر ہر جسم اپنے ابعاد (Dimensions) کے لحاظ سے محدود ہے۔ اور طول و عرض اور عمق کے اعتبار سے متناہی ہے تو اس کے صاف صاف معنی یہ ہیں کہ ان اجسام کا تار و پود جن اجزاء سے بنا ہے، وہ بھی محدود ہیں۔ ورنہ یہ لازم آئے گا کہ غیر محدود اجزا سے محدود جسم وجود میں آئے گا۔ اور اگر اس استحالہ کو تسلیم کر لیا جائے تو اس پر دوسرا استحالہ یہ ابھرے گا کہ چھوٹے اور بڑے جسم میں فرق و امتیاز کے تمام حدود ہی یکسر ختم ہو جائیں گے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں نظام کے تصور 'طفرہ' کی مختصر تشریح کر دیں۔ اس کا تعلق بھی دراصل جز لایتجزی کے اثبات و ابطال ہی سے ہے۔ حکما جو اجزاء لایتجزی کو نہیں مانتے اور تحلیل و تجزیہ کے تسلسل کے قائل ہیں۔ ان کی ایک دلیل زینو کا یہ اشکال بھی تھا کہ حرکت جب خط کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک حصہ کو طے کرے گی، تو دوسرا حصہ باقی رہ جائے گا۔ اور پھر اس دوسرے حصے تک پہنچے گی، تو اس کا نصف یا ثلث و ربع باقی رہ جائے گا۔ اور پھر اس نصف یا ثلث و ربع تک وسعت پذیر ہو گی تو اس نصف کا نصف اور ثلث و ربع باقی رہ جائے گا۔ اور اس طرح یہ حرکت کبھی بھی کسی متعین فاصلہ کو طے نہ کر سکے گی۔ اس کا صحیح صحیح جواب تو حرکت کے بارہ میں جدید ترین تحقیق نے بہم پہنچایا۔ نظام نے اس اشکال کا جواب یوں دیا ہے کہ حرکت کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ وہ نقطہ بہ نقطہ ایک ایک شے کو طے کر کے آگے بڑھتی ہے۔ بلکہ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے کے لیے وہ جست اور طفرہ کو کام میں لاتی ہے۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ پہلے وہ نقطہ کا نصف طے کرے، پھر اس نصف کا نصف طے کرے کیونکہ وہ تو بغیر اس کے درمیانی مقامات پر رُکے آگے بڑھ جانے کی عادی ہے۔ ذرہ اور اس کے متعلقات کی بحث تو جیسا کہ ہم نے ذکر کیا محض ایک مثال ہے۔ دراصل قارئین سے ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جلد ثانی میں خیالات و افکار کے جو گوہر ہائے تاباں بغیر کسی منطقی ترتیب کے ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کو اگر سمیٹ کر نظم و ترتیب با قرینے سے بیان کیا جائے تو مندرجہ ذیل عنوانوں میں ان کو تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) ذات و صفات میں رشتہ و تعلق کی نوعیت

(۲) علم الٰہی اور اس کی وسعتیں

(۳) قدرت الٰہی اور اس کے حدود و اطلاق

(۴) مسئلہ خلق

(۵) ارادۂ الٰہی

اس تقسیم کو ہم جامع تو کہہ سکتے ہیں، مگر حاصر یا مانع نہیں۔ کیونکہ ان افکار و خیالات کے ساتھ بیسیوں ایسے اجتماعی، دینی اور علمی نکات بھی زیر بحث آگئے ہیں جن کو متکلمین اسلام کی طرفہ طرازیوں کے سوا اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی وضاحت ہم متفرقات کے ضمن میں علاحدہ کریں گے۔

(باقی آئندہ)

© rasailojaraid.com